

شورائی نظام کا احسنی مرحلہ

۳

محمد یوسف گورایہ، ریسرچ فیڈرل ادارہ تحقیقات اسلامی

حضرت عثمان کے دور خلافت اور بعد میں یہ مسئلہ اپنی پوری شدت کے ساتھ سامنے آیا۔ یہ مسئلہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے قریشی عربوں اور غیر قریشی عربوں کے تعلق کی حیثیت رکھتا تھا، حضرت ابو بکرؓ جو مجموعی طور پر عربوں کی نفسیات و عادات سے پوری طرح واقف تھے، قریشی عربوں اور دوسرے عربوں کے مسئلے کو سمجھانے میں کامیاب ہو گئے۔ لیکن ان کے بعد جب عربوں اور غیر عربوں کا مسئلہ درپیش ہوا تو ان کے جائزہ لےنے سے یہ مسئلہ کامیابی کے ساتھ حل نہ ہو سکا، یہ جائزہ لینے ایک طرف تو مفتوحہ اقوام کی معاشرت عادات و خصائل اور رسوم و رواج پر پوری طرح احاطہ نہ کر سکنے کی وجہ سے ان کی مجموعی نفسیات سے پوری طرح واقف نہ ہو سکے، جو عربوں اور غیر عربوں کے امتزاج کے لیے بنیادی چیز تھی۔ دوسری طرف خود عربوں کی خانہ جنگیوں نے انہیں اس بات کی فرصت بھی نہ دی کہ وہ اس بنیادی مسئلے کی طرف توجہ دے سکیں۔ عربوں اور غیر عربوں کے امتزاج کے راستے کی یہ دو زون رکاوٹیں تھیں یا نصف مدی تک بدستور قائم رہیں اور اس دور میں "مقتضیہ" کی وحدت میں انتشار پیدا ہوتا رہا، چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت عثمان کے دور خلافت کے آخری سالوں سے لے کر عبدالملک بن مروان کے عہد میں حضرت عبداللہ بن زبیر کی شہادت ۴۰ھ تک یہ پورا دور مسلسل خانہ جنگیوں کا دور ہے۔ خانہ جنگیوں کا یہ سلسلہ مدینہ میں حضرت عثمان کی شہادت سے شروع ہوا کہ پورے عراق کو اپنی لپیٹ میں لیتا ہے، جمل کی جنگ ابھی ختم ہی ہونے والی تھی، کہ صفین کی زبردست تیاریاں شروع ہو گئیں۔ صفین میں صابر کے خون کی ندیاں ابھی بہ رہی تھیں کہ ہزدان کا معرکہ کارزار شروع ہو گیا، اور یہ اس وقت ختم ہوا جبکہ حضرت علیؓ کو موت کی نیند سٹکا دیا گیا، ان کی شہادت کے فوراً بعد عراق و شام دوبارہ معرکہ آرائی کے لیے شب و روز تیاریوں میں مصروف ہو گئے، اگرچہ حضرت حسن نے صلح کر کے متحارب فوجوں کو

ہام رٹن سے بچایا، لیکن آئندہ چند سالوں میں جن میں حضرت معاویہ نے حکومت کی، اور حقیقت متحارب گروہوں کو موقوف کیا کہ وہ باقاعدہ سیاسی اور مذہبی فرقوں میں منظم ہو جائیں اور موقوف ملتے ہی خون کی ندیاں بہادیں۔

حضرت معاویہ کی وفات کے ساتھ ہی بنو امیہ، شیبہ اور خوارج پوری تیاریوں کے ساتھ ایک دوسرے کے خلاف فیصلہ کن معرکہ آرائی کے لیے تیار تھے، اس کا آغاز مدینہ کی تباہی سے ہوا، اور پھر مکہ اور عراق منظم طور پر بنو امیہ کو بیخ و بن سے اکھاڑنے کے لیے میدان جنگ میں کود پڑے، یزید کے بعد بنو امیہ کی حالت زار نے عبداللہ بن زبیر کے لیے کامیابی کے راستے صاف کیے، لیکن مردان بن حکم کی زیر قیادت زاب کی خونریز جنگ نے مردان کے بعد عبدالملک بن مردان کو موقوف دیا کہ وہ پہلے پورے عراق میں خانہ جنگیوں کا صفحہ پاک کرے اور بعد میں حجاز کی زیر کمان مکتہ میں عبداللہ بن زبیر کے حقتے کے بعد پورے حجاز کو مطیع و فرمانبردار بنائے، چنانچہ ۲۵ھ سے ۳۰ھ تک بحجز امیر معاویہ کے عہد کے چند آخری سالوں کے پورے کا پورا دور خانہ جنگیوں میں گزرا، اور ایسا موقوف میسر نہ آسکا جس میں "مقتنہ" کی وحدت کے لیے دوبارہ کوشش ہوتی،

عربوں اور غیر عربوں کے امتزاج کی راہ میں جو دوسری رکاوٹ حاصل تھی، وہ مفتوحہ اقوام کے عادات و خصائل اور معاشرت، معیشت اور سیاست سے پوری طرح واقفیت حاصل نہ ہونا تھی، دراصل رکاوٹ کا یہ سبب مسلح خانہ جنگیوں کی وجہ سے پیدا ہوا، اس دور میں منکرین اور مجاہدین میں امتیاز نہیں تھا، جہاد مذہبی فریضے کی حیثیت سے زاہد و عابد پر بھی اسی طرح فرض تھا جس طرح عام دنیا دار اور سیاسی و اقتصادی میدانوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے والے کے لیے۔ اس لیے جہاد غیر مسلموں کے خلاف ہو یا سیاسی اور مذہبی، عبصیت کی وجہ سے خانہ جنگی ہو، ہر مسلمان کا فرض تھا کہ اس میں عملی طور پر شریک ہو۔ یہی وجہ تھی کہ وہ لوگ جو ذہین طبیعت (INTELLIGENTZIA) یا منکرین (THINKERS) کا رول ادا کر سکتے تھے، مجبور تھے کہ مجاہدین کی صف میں بھی کھڑے ہوتے، اس لیے خانہ جنگیوں کے اس دور میں ایسا طبقہ معرض وجود میں نہ آسکا، جو مفتوحہ اقوام کے سیاسی، معاشرتی، اور اقتصادی حالات کا بنیاد مطالعہ کر کے، اسلامی اور عربی اصولوں کو غیر عربی نفسیات پر منطبق کرتا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عربوں اور غیر عربوں کے اختلاف کی خلیج روز بروز وسیع ہوتی گئی، اور غیر عربوں کی اسلامی تعلیمات سے واقفیت نہ، جو ممالک میں مساوات کی ممانی تھیں، غیر عرب مسلمانوں کو اپنے بنیادی حقوق کے حصول کے مطالبے کی شدت میں تیز تر کر دیا۔

جدید مصلحتات کی رُو سے، اگر اس زمانے کی سیاست پر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا، کہ غیر عرب مسلمان

اس دور میں دراصل حزب اختلاف کی حیثیت اختیار کر رہے تھے۔ اور عربوں کی سیاست پر اجارہ داری کی وجہ سے حزب اختلاف کا کردار ادا کرنے پر مجبور ہو رہے تھے۔ اس لحاظ سے یہ کہہ سکتے ہیں کہ حزب اقتدار اور حزب اختلاف کی جدید اصطلاحات کی مشابہت، اسلامی تاریخ میں اس وقت پیدا ہوئی جبکہ مسلمانوں کے برسر اقتدار طبقے نے مفروضہ اقرار کو، حقوق دینے کی راہ میں رکاوٹیں پیدا کیں۔ ایک طرف تو مفروضہ اقرار کو اپنی قدیم اعلیٰ تہذیب و ثقافت پر ناز تھا، اور دوسرے وہ اسلام کی بنیادی تعلیمات میں مساوی حقوق کی حوصلہ افزائی پاتے تھے، لیکن برسر اقتدار طبقے کی سیاست پر اجارہ داری کی وجہ سے وہ اپنے حقوق کی بجا آوری کو محال دیکھتے تھے۔ ان حالات سے مجبور ہو کر، انہوں نے ”مدرسے“ (۸۹۵ء) کی راہ اختیار کی، اور وہ سیاست میں ناکامی کے بعد، علمی طور پر عربوں پر تفوق حاصل کرنے کی طرف مائل ہوئے، اور اس راستے سے وہ رائے عامہ کو حکومت کے خلاف ہموار کرنے میں مصروف ہو گئے۔ عرب اپنی خانہ جنگیوں میں مصروف تھے۔ اور غیر عرب مسلمان مسلسل علمی اور فکری ذرائع سے اپنے حقوق کی بجا آوری کے لیے کوشاں تھے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب عرب اپنی خانہ جنگیوں سے فارغ ہوئے، تو انہیں معلوم ہوا کہ اس دوران زمین ان کے پاؤں سے نکل چکی تھی۔ اور غیر عرب مسلمان اپنی خفیہ اور علمی کاوشوں میں کامیاب ہو کر اب اس قابل ہو چکے تھے کہ عربوں کی سیاست پر اجارہ داری کے ناقابل برداشت بوجھ کو اتار پھینکیں۔ اور جب غیر عربوں کی سیاست پر غلبہ ہوا تو بنو امیہ کے، جو عربوں کے نمائندہ خاص تھے، مروجوں تک کو صاف نہیں کیا گیا۔

اسلامی تاریخ کے اس پس منظر سے یہ معلوم ہوا کہ شیخین حضرات ابو بکر و عمر کے دور خلافت کے بعد سے بنو امیہ کے خاتمے تک اسلامی سلطنت میں دور خمی پالیسی پیدا ہو گئی، ایک طرف برسر اقتدار طبقہ تھا، جو حکومت کا کاروبار چلانے کے لیے مختلف مقامات اور مختلف حالات کے پیش نظر قانون سازی کرتا تھا، اس کے نامزد کردہ عہدے (۱) مختلف علاقوں کے مخصوص معاشرتی، معاشی اور سیاسی حالات کے مطابق قانون بناتے اور ان پر عمل کرتے اور کرواتے تھے۔ دوسری طرف ایک دوسرا طبقہ، جو برگشتہ نہ تھی، یقیناً حکومت کا معاون نہ تھا، اپنے طور پر قانون سازی میں مصروف ہو گیا۔ چنانچہ ابن المقفع نے جس کی حیثیت ایک طرح سے سٹیٹ سیکرٹری کی تھی اس پوری صورت حال کی امیر المؤمنین ابو جعفر منصور کو خطاب کر کے یوں وضاحت کی۔

”امیر المؤمنین کے لیے جو مائل غور طلب ہیں، ان میں متن قصص احکام کا اختلاف ہے، جو انتہائی سنگین صورت اختیار کر چکا ہے۔ قصص، ازدواجی تعلقات اور مالی معاملات میں یہ اختلاف بڑی نازک شکل اختیار کر چکا ہے، جس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ ایک نفس کی حرمت اور ازدواجی رشتہ جو جو میں حلال قرار پاتے ہیں، وہی کو ذمہ حرام

ہو جاتے ہیں۔ ایسا ہی اختلاف خود اندرونِ کوفہ ہو رہا ہے، یہاں ایک محلے میں ایک چیز ممال بے اور دوسرے میں وہی حرام ہے، مسلمانوں میں ان تین تفرقہ احکام پر عمل ہو رہا ہے، اور ایسے قانونوں کے ذریعے ان کے فیصلے ہوتے ہیں، جن کے احکام نافذ اور جاری و ساری ہوتے ہیں، اس کے باوجود حال یہ ہے کہ اہل عراق اور اہل حجاز میں کوئی بھی جماعت ایسی نہیں جو اپنے طریقوں پر نازاں و فرحان نہ ہو، اور جو اپنے سوا دوسروں کی روایت کا مذاق نہ اڑاتی ہو۔ اس صورت حال سے یہ شکل پیدا ہو گئی ہے، کہ جو بھی عقلمند اسے سنتا ہے، اسے اس سے دیکھ پہنچتا ہے (۹۰)۔

قانون سازی کی اس دورخی پالیسی کے نتیجے میں تنازع کے پیش نظر بنو عباس کے ابتدائی خلفائے کاشش کی کہ وہ اس خلیفہ کو پائیں، جو ان سے پہلے ایک صدی کے دوران پیدا ہو گئی تھی۔ بنو عباس کی اس تحریک کے پیچھے بہت سے عوامل ہیں سے دو سب سے عامل تھے۔ ایک یہ کہ انہوں نے غیر عرب مسلمانوں کا تعاون اس شرط پر حاصل کیا تھا کہ وہ عربوں کی سیاسی اجارہ داری کے خلاف ان کی مدد کریں گے، اور اب کامیابی کے بعد ان کا فرض تھا کہ وہ ایسا لائحہ عمل مرتب کریں جس میں تمام مسلمانوں کے مساوی حقوق کی بنیاد پر ضابطہ حیات ترتیب پائے۔ اور دوسرے مفہم انتقامیہ اور عدلیہ کے منتشر نظام سے جو عملی و شعاریاں پیش آرہی تھیں وہ اس بات کی متقاضی تھیں کہ کوئی ایسا متفق علیہ لائحہ عمل مرتب ہو، جس پر مسلمانوں کا اتفاق ہو، اس داعیہ کے پیش نظر بنی امیہ کی تجویز پر سنجیدگی کے ساتھ غور کیا گیا، اور ابتدائی خلفائے بنی عباس میں بعض نے (۹۱) امام مالک بن انس پر زور دیا کہ وہ اس ضرورت کو پورا کریں، اور خاص طور پر ہدایت کی کہ وہ ایسی کتاب ترتیب دیں جو جامع ہو، جس میں افرط و تقریط نہ ہو، جس میں عبداللہ بن عمر کے شہداء، عبداللہ بن عباس کی رضعتیں اور عبداللہ بن مسعود کے شواہد شامل نہ ہوں، اور سلاطین اور مورخوں کو ملحوظ رکھیں، اور ایسا راستہ بتائیں جو صحابہ اور ائمہ کا مجمع علیہ ہو (۹۲) جس کے جواب میں امام مالک نے الموطا تیار کی، جو کسی حد تک مندرجہ بالا ضروریات کو سمیٹتی تھی، اگرچہ امام صاحب نے کتاب توثیق کر دی اور خلفائے اسے پسند بھی کیا اور اسے پوری سلطنت میں بطور قانون نافذ بھی کرنا چاہا، لیکن امام صاحب نے اسے نافذ کرنے سے گریز کیا، واصل پوری امت کے لیے لائحہ عمل مرتب کرنے کا کام کسی ایک فرد کے بس میں نہ تھا، اس کام کے لیے ضروری تھا کہ پوری سلطنت کے تمام علاقوں کے مسافر تھے، معاشی اور ثقافتی حالات کا جائزہ لیا جاتا، اور اس صح شدہ معلومات کے ذخیرے کو اسلامی اصولوں کے مطابق ڈھال کر ایک ضابطہ حیات ترتیب پاتا، بنو عباس نے حالات سے مجبور ہو کر اس کی تحریک کی، لیکن جو طریقہ انہوں نے اس کام کی انجام دہی کے لیے اختیار کیا وہ یقیناً اس کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔ کسی ایک فرد کی آرا کو، جو یقیناً اس وسیع و عریض سلطنت کے ایک مخصوص علاقے اور مخصوص حالات کی آئینہ دار تھیں، انہیں پوری سلطنت کے تمام علاقوں اور

تمام حالات پر منطبق نہیں کیا جاسکتا تھا، اس سلسلے میں جہاں ایک طرف بزعباس کے خلفاء کی کوتاہ نظری سامنے آتی ہے کہ انہوں نے اس بارگراں کو فہرہ و دوا پر ڈالنے کی کوشش کی، وہاں دوسری طرف امام مالک کی بصیرت اور وسعت نظری کا اعتراف کرنا پڑتا ہے، کہ انہوں نے اپنی ذاتی برتری علمی تفوق اور فقہی علو کو دوسروں پر ٹھونکنے کی بجائے مشورہ دیا کہ چونکہ مسلمان اپنے اپنے مخصوص علاقوں میں پیدا ہونے والی مخصوص فقہ پر گامزن ہوئے ہیں، اس لیے بہتر نہیں کہ ایک خاص خطہ حجاز کی فقہ کو شام، عراق، ایران، مصر، افریقہ، اندلس اور سندھ کے مختلف اور مخصوص حالات کا جائزہ کیے بغیر ان پر ٹھونس دیا جائے (۹۶) بزعباس نے اس سلسلے میں جو بڑی غلطی کی، وہ یہ کہ انہوں نے امت میں ایک سو سال کے طویل عرصے میں پیدا ہونے والی وسیع و عریض خلیج کو پاٹنے کا جو طریقہ اختیار کیا۔ بڑا نام تھا اور اتنی بڑی ذمہ داری کو ایک فرد کے کندھوں پر ڈال کر وہ اس سے بری الذمہ نہیں ہو سکتے تھے، ہمارے خیال میں اگر اس مسئلے کو اس طرح سمجھا جاتا جس طرح یہ لکھا تھا تو نتیجہ اچھا برآمد ہونے کی توقع تھی، جیسا کہ ہم نے دیکھا اس میں پچھیدگی اور الجھاؤ اس وقت پیدا ہوا، جب کہ متفقہ حکومت کے وظائف ٹائٹل میں سے ایک مستقل وظیفہ ہونے کے بجائے دو حصوں میں بٹ گیا، ایک طرف حکومت اپنا حکومتی کاروبار چلانے کے لیے عملی ضروریات کے تحت قانون سازی کر رہی تھی۔ دوسری طرف "غیر آئینی" طور پر بعض افراد اسی مسئلے میں مصروف تھے۔ دوسری قانون سازی کا یہ طریقہ عہد رسالت اور عہد حضرات ابو بکر و عمر میں ناپید تھا، چنانچہ مسئلے کا حل یہ تھا کہ "متفقہ" کی اس دورخی پالیسی کو ختم کر کے اس میں یک جہتی اور وحدت پیدا کی جاتی۔ اور "متفقہ" کو "غیر آئینی" ہاتھوں سے چھین کر پھر سے حکومت اسلامیہ کا ایک باقاعدہ اور مستقل وظیفہ قرار دیا جاتا اور یہ متفقہ بدلتے ہوئے حالات کے تحت معاملات میں تیز و تبدیل کو پیش نظر رکھ کر اسلامی اصولوں کی بنیاد پر قانون سازی کرتی۔ مجلس قانون ساز کے ارکان کا انتخاب جدید طریق انتخاب کی طرح چونکہ اس زمانے میں ممکن نہیں تھا، اس لیے سرسبز حال سے نکلنے کے لیے یہ طریق کار میں ممکن اور عملی تھا کہ خلیفہ مختلف علاقوں کے نامور فقہاء کو نامزد کر کے انہیں ارکان مجلس قانون ساز قرار دیتا، یہ مجلس قانون ساز سلطنت کے لیے ہر علاقے کی ایک تو نمائندہ ہوتی، اور دوسرے قانون سازی میں یک جہتی اور وحدت پیدا کرتی، مثلاً عراق سے امام ابو حنیفہ نعمان بن ثابت، سفیان بن سعید ثوری، شریک بن عبداللہ الحنفی، محمد بن عبدالرحمن بن ابی یعلیٰ، ابو یوسف یعقوب بن ابراہیم، زفر بن ہذیل بن قیس کوفی، محمد بن حسن شیبانی، حجاز سے: امام مالک بن انس اور مدینہ اور مکہ کے دوسرے فقہاء، مصر سے ابو محمد عبداللہ بن وھب بن مسلم قرطبی، ابو عبداللہ عبدالرحمن بن العاصم المعتقی، اہل افسانہ لقیہ اور اندلس میں سے، ابو عبداللہ زیاد بن عبدالرحمن القرطبی، ملقب بشبلیون، شام سے ابو عبدالرحمن بن محمد لاو زاعی و غیرہ۔ و غیرہ۔ ان سب فقہاء اور اسی طرح کے

دوسرے علماء کو بنو عباس کے ابتدائی خلفاء میں کوئی خلیفہ بجائے صرف امام مالک کو دعوت دینے کے نامزد کر کے ایک مجلس میں جمع کر دیتا اور ان سے یہ کام لیتا۔ اس سے ایک طرف تو مقتضی حکومت کا ایک وظیفہ قرار پاتی جس سے بننے والا ہر قانون پوری سلطنت میں نافذ ہوتا، اور دوسرے دور نئی پالیسی ختم ہوتی جس کی وجہ سے پوری سلطنت انتشار اور فساد کی آماجگاہ بنی ہوئی تھی۔ بد قسمتی سے ایسا نہ ہو سکا اور خلفاء بنو عباس نے فقہی مجاز امام مالک کو دعوت دے کر اپنے آپ کو اس اہم فریضے کی انجام دہی سے بری الذمہ سمجھا لیا۔ اگرچہ بنو عباس کی ایک جہتی کی تحریک ان کی اپنی کوتاہ فہمی کی وجہ سے کامیاب نہ ہو سکی، لیکن اس کا ایک فائدہ ضرور ہوا کہ امام مالک کی تقلید میں سلطنت کے مختلف علاقوں کے فقہاء نے اپنے اپنے علاقے کی فقہ کی تدوین کی طرف توجہ دی۔ اور اس طرح علاقائی طور پر فقہ حجاز، فقہ عراق، فقہ شام اور فقہ مصر مدون ہو گئیں۔ کاش بنو عباس ان غیر آئینی ”صوبائی اسمبلیوں“ کی فقہ کو ”آئینی اسمبلیاں“ قرار دے کر ایک ”قومی اسمبلی“ کی تشکیل دے دیتے اور ان ”صوبائی اسمبلیوں“ کی فقہ کو ”قومی اسمبلی“ کی فقہ بنانے کی طرف توجہ دیتے، اس سے نہ صرف اس وقت کی ضرورت پوری ہوتی بلکہ اسلامی فقہ کی تاریخ کا آج نقشہ ہی دوسرا ہوتا۔

مقتضی حکومت کا باقاعدہ وظیفہ بنانے کا یہ سہی موقع بنو عباس نے کھو دیا اور اس وقت سے موجودہ دور تک اس وسیلے پر پائے پر ایک جہتی اور ہمہ گیر پیادگی پیدا کرنے کا دوبارہ موقع امت کو کبھی نصیب نہ ہو سکا، اگرچہ اسلامی ممالک کے مختلف فرما روائی نے کبھی کبھی اپنے اپنے ملکوں کے مخصوص حالات کے پیش نظر علاقائی فقہ کی جمع و تدوین کے لیے مختلف کوششیں کیں۔ خلیفہ ناموں کے بارے میں مشہور ہے کہ اس نے باقاعدہ ایک مرکزی جماعت تشکیل دی تھی۔ امیر علی کا بیان ہے، ناموں کے عہد میں ایک باقاعدہ کونسل آف سٹیٹس ممبروں وجود میں لائی گئی جس میں سلطنت کے ہر علاقے اور ہر ملت کی نمائندگی موجود تھی، عوام کے نمائندوں کو اپنی آراء کے اظہار کی مکمل آزادی تھی، اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شورشانی بحث و مباحثہ میں ان خیالات پر کسی قسم کی کوئی پابندی نہ تھی“ (۱۹۵) ظاہر ہے کہ یہ کونسل ان حضرات پر مشتمل نہ تھی جو بنو امیہ کے عہد میں قائم ہو جانے والے ”نظام مدرسہ“ کے نمائندے تھے۔ بلکہ یہ عوام کے نمائندے تھے جن کا انتخاب خلیفہ کی صوابدید پر منحصر تھا۔ اور جو حکومت کے ساتھ وفاداری کا عہد باندھتے تھے، اس دور میں اور اس کے بعد آل بویہ، سامانیہ، سلجوقیہ اور ایوبیہ کے عہدوں میں ایسی مشاوری کونسلیں ہوتی تھیں۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ نظام مدرسہ بھی چلتا رہا۔ اس نظام کو چلانے کے لیے حکومت نے اسے اپنی تحویل میں لیا اور اس کے اساتذہ اور مدرسین کا تقرر حکومت کے مشورے سے ہوتا تھا۔ جیسا کہ نظام الملک نے اس سلسلے میں نام پدایا۔ پھر سوک کبھی بھی حکومت کی پالیسیوں اور اس کی حکمت عملیوں کی راہ میں حائل نہیں ہوئے۔ اگر کوئی مدرسہ حکومت کی تحویل سے باہر بھی تھا تو

در ریاست کے متعین متعلقہ حکومت کے قانون یا اس کی پالیسیوں کی راہ میں کبھی رکاوٹ نہیں بنے۔

قیام پاکستان کے بعد اس سرزمین کے مسلمان ایک بالکل نئی صورت حال سے دوچار ہوئے، حکومت برطانیہ نے آزادی وقت جو چیزیں ورثہ میں چھوڑیں، ان میں ایک اسمبلی کا ادارہ بھی تھا۔ دور جدید کی اسمبلی اپنی جدید اصطلاح، مفہوم اور مقصد کے اعتبار سے حکومت اسلامیہ کا کبھی بھی باقاعدہ اور آزادانہ وظیفہ نہیں رہی تھی، جب کہ آج تقریباً ہر ملک میں وظائف ثلاثہ میں سے اسمبلی ایک باقاعدہ مستقل اور آزاد ادارہ ہے، جہاں عوام کے منتخب نمائندہ سے جمع ہو کر پورے ملک کے لیے قانون سازی کرتے ہیں۔ چونکہ مجلس قانون سازیا اسمبلی ایک نہایت مفید، اہم اور کارآمد ادارہ تھی۔ جس کی افادیت اور اہمیت سے انکار ممکن نہیں، اس لیے آزادی کے بعد پاکستان کے تمام مسلمانوں کو اس کی ایٹنی حیثیت اور ضرورت کو تسلیم کیا، چنانچہ جب پاکستان کا مطالبہ ہوتا ہے یہی ادارہ سب کی توجہ کا مرکز بن جاتا ہے

اسمبلی کی اس افادیت اور اہمیت کے اعتراف کے باوجود ملک میں مسلمانوں کا ایک طبقہ اس کی کارگزاریوں سے بیزاری کا اظہار کرنے لگا، اور اس سے اسمبلی کے نمائندوں اور خصوصاً حکومت کے بارے میں جس کے وظائف ثلاثہ میں سے اسمبلی بھی ایک وظیفہ تھی، سخت مماثلہ رویہ اختیار کیا، حتیٰ کہ وہ علامتہ مخالفت پر اتر آیا، اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ اسمبلی سے پاس ہونے والے ہر قانون کی مخالفت کرنا اس نے اپنا فرض خیال کیا، پاکستان میں اس طبقے کے معرض وجود میں آنے کے بہت سے عوامل اور بیحد پیچیدہ اسباب تھے، بہر حال ملک میں ایک طبقہ سیاسی اغراض کے پیش نظر اسلامی قانون کے نام سے ملکی قانون سازی کے ادارے کے متوازی ظاہر ہونے لگا، اور آخر میں اس نے ملک کے بیشتر مذہبی افراد کو بھی اپنی طرف کھینچنے کی کوشش کی، قرون اولیٰ میں عربوں اور غیر عربوں کی کشمکش نے ایک طبقے کو جنم دیا۔ جس کے تکلیف دہ نتائج قانون سازی کی دوزخی پالیسی پر منتج ہوئے۔ قیام پاکستان کے بعد ایسی کوئی دوجہ موجود نہ تھی کہ دوسری قانون سازی کی تاریخ کو دہرانے کا موقع ملتا، کیونکہ یہاں عربوں اور غیر عربوں کے درمیان غیر مساوی حقوق کی وجہ سے کسی خاص طبقے کے ساتھ بے انصافی نہیں ہوئی تھی، ہر سند و ہر جماعت اور ہر طبقے کو ایٹنی طور پر منتخب ہو کر قانون سازی میں حصہ لینے میں ہر قسم کی آزادی حاصل تھی حتیٰ کہ عورتوں تک کو حق دیا گیا تھا اور ان کے لیے نشستوں تک محفوظ تھیں، پھر اسمبلی کا ایک نہایت مفید ادارہ موجود تھا، جس میں ہر فرد اپنی آواز بلند کر سکتا تھا۔ اور اکثریت کو اپنی رائے کا قائل کر کے قانون سازی کو اکثریت کی خواہش کے مطابق کرا سکتا تھا۔ لیکن امر واقعہ یہ ہے کہ ان تمام آسانیوں کے باوجود بعض افراد کی طرف سے ایسے خیالات کا اظہار ہونے لگا جو اتفاق و اتحاد کی جگہ افتراق و انتشار کے سامنے

تھے۔ اور انہوں نے جب اپنے خیالات اور خواہشات کی تکمیل جمہوری اور شرفرائی نظام سے پوری ہوتی نہ دیکھی تو انہوں نے ماضی کے تجربے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے "پاکستانی اور اسلامی قانون سازی" میں فرق کر کے عوام کو ایک عجیب و غریب ذہنی کش مکش میں مبتلا کر دیا۔ ذیل میں ہم اس کے اسباب و علل کا جائزہ لیتے ہیں۔

اسمبلی کی ایٹنی حیثیت و اہمیت کے اعتراف کے بعد جب ملک میں عام انتخابات ہوئے اور ملک کے منتخب نمائندے قانون سازی کے لیے مجلس قانون سازی میں پہنچے۔ تو وہ حضرات جو جمہوری طریق پر کامیاب نہ ہو سکے، ملک کے ایٹنی اور جمہوری نمائندوں پر نکتہ چینی کرنے لگے، ان کے اعتراف کا سب سے بڑا امر کوئی نقطہ یہ تھا کہ نمائندگان اسمبلی اس کے اہل نہیں کہ وہ اسلامی قانون سازی کا کام انجام دے سکیں، ان کے خیال میں نمائندگان اسمبلی چونکہ اسلام کے بنیادی آئندے واقف نہیں لہذا وہ اس کی قانون سازی کا کام انجام دے سکتے کے اہل نہیں۔ انہوں نے اس بنیادی نقطہ پر نمائندگان اسمبلی کی نااہلیت پر زبردست تہقید کی، لیکن وہ غرض نکتہ چینی سے آگے نہ بڑھ سکے اور دوسری طرف اسمبلی کی ایٹنی حیثیت چونکہ انہیں بھی تسلیم تھی اور اس کے وجود اور اس کے مقصد کے خلاف وہ باقاعدہ بناوٹ کرنے کی جرأت نہ کر سکے، اس لیے نمائندگان اسمبلی اپنے کام میں مصروف رہے اور اسمبلی کی کاروائی ملک کا باقاعدہ قانون بنی چلی گئی۔

شروع شروع میں یہ طبقہ صرف نمائندگان اسمبلی کی نااہلیت پر ہی سب سے زیادہ متعزز تھا اور اس نے سب سے زیادہ زور اس بات پر دیا کہ اسلامی علوم سے ناواقف لوگ اسلامی قانون سازی کا حق ادا کرنے کے اہل نہیں، لیکن جب اسمبلی کی عملی کاروائی جاری رہی اور وہ قانون کا جامہ پہن کر خود ان پر نافذ ہونے لگی۔ تو اب ان کے لیے یہ ایک نیا تئیر پیدا ہوا، وہ یہ کہ "نمائندگان اسمبلی" اسلامی علوم سے عاری ہونے کی وجہ سے اپنے فرائض کی انجام دہی میں نااہل ہیں، اس لیے ملک میں قانون ساز کا حق صرف ان لوگوں کو ہے، جو اسلامی علوم سے واقف ہیں۔ اور پھر کچھ ویر لوب اس نظریے میں تیسری ترقی یہ ہوئی کہ ملک میں اسلامی علوم سے واقف صرف وہ خود ہیں۔ اس لیے ملک میں قانون سازی کا حق صرف انہیں ہے۔ لہذا جو کچھ وہ کہیں وہ قانون ہرگا، اور جس کی وہ مخالفت کریں وہ قانون نہیں ہوگا، جب تک اس نظریے کو گول مول سورت میں پیش کیا جاتا رہے۔ عوام کی ہمدردیاں بیشک ان کے ساتھ تھیں۔ جب اس نظریے کو صاف

صاف اننا مذموم یوں بیان کیا گیا کہ اسلامی علوم سے واقفیت صرف "انہیں" ہی ہے اس لیے قانون سازی کا حق صرف "انہیں" کو پہنچتا ہے تو عوام میں زبردست اضطراب پیدا ہوا، ایک طرف وہ اسمبلی کی ایٹنی حیثیت تسلیم کر کے اس کی طرف سے بننے والے قوانین پر عمل کرنے پر مجبور تھے۔ اور دوسری طرف وہ ان "حضرات" کا جہان کے ماضی کا نمائندہ ہونے کے وجود پر تھے احترام پر بھی مجبور ہوئے۔ لیکن ان کی سمجھ میں یہ بات نہ آتی تھی کہ کس قانون کا وہ دل سے احترام

کریں نائیدگان اسمبلی کے قانون کا یا "ان کے قانون کا؛ حقیقت یہ ہے کہ صورت حال اب تک اسی طرح پر قائم ہے، اور اگر کوئی مؤثر اقدام نہ کیا گیا تو عوام "دوہری و ناداری" کے تقاضے و تریک پورے نہ کر سکیں گے۔

اگر اس صورت حال سے نکلنے کے لیے یہ چند تجاویز پیش کرتے ہیں

- ۱۔ عوام کو دور جدید میں اسمبلی کی آئینی حیثیت، ضرورت اور اہمیت کے متعلق زیادہ سے زیادہ معلومات بہم پہنچانی جائیں اور انہیں اس کی عملی افادیت اور دور جدید میں اس کے صحیح مقام سے زیادہ سے زیادہ واقف کرایا جائے۔
- ۲۔ ملک میں "دوہری قانون سازی" کے نقصانات اور اس کے ہولناک نتائج سے عوام کو روشناس کرایا جائے اور نظام قانون سازی میں وحدت کی افادیت اور اہمیت کا احساس عوام میں بیدار کیا جائے۔
- ۳۔ عوام کو اس بات کا احساس دلایا جائے کہ مجلس قانون ساز کے اصل مالک اور نائیدگان اسمبلی کو منتخب کرنے والے واصل وہ خود ہیں، اس لیے جسے وہ قانون سازی کا اہل سمجھیں اور جس قسم کی قانون سازی وہ چاہیں اس قسم کے نائیدے منتخب کریں۔

۴۔ ملک میں جو فرد یا گروہ یا جماعت اپنے آپ کو ملک کی مقصد کا سب سے زیادہ اہل سمجھتی ہو، اسے چاہیے کہ انتخاب کے وقت وہ اپنے آپ کو مجلس قانون ساز کے لیے امیدوار کھڑا کرے اور خود کو منتخب کر دے اور آئینی طور پر اپنی اہلیت سے قانون سازی کا فریضہ انجام دے

ہمارے خیال میں اگر دن چار نفاذ پر عمل کیا جائے تو ملک میں موجود وہ سنی انتشار کا کچھ نہ کچھ مداوا ضرور ہو سکیگا۔ وہ حضرات جو اسلام کی آڑ میں اپنے سیاسی مقاصد کی بنا آوری چاہتے ہیں ان سے درخواست کی جائے کہ بیسویں صدی میں قانون سازی کا کام بہر حال مجلس قانون سازی ہی انجام دے گی، اس لیے اگر وہ دوسروں کی نسبت اپنے آپ کو اس کیلئے زیادہ اہل سمجھتے ہیں تو آئینی اور تقویری طریق کار کے مطابق انتخاب کے وقت اسمبلی کے امیدوار کی صورت میں اپنے آپ کو پیش کریں، منتخب ہو جانے کی صورت میں تو بہر حال وہ اپنی اہلیت سے کام لے کر قانون سازی کا کام کریں اور ناکامی کی صورت میں مذہب کو آٹھبٹانے کے بجائے اپنی کوتاہیوں کا جائزہ لیں۔ اور سمجھیں کہ عوام انہیں قانون سازی کے لیے اپنا نائیدہ بنا نا پسند نہیں کرتے۔

عوام جو دراصل "دوہری و ناداری" کے پیکر ہیں جنہیں کسب سے زیادہ پریشانی اور مشکل میں گرفتار ہیں ان کے لیے بھی اس طریق کار سے اطمینان اور آسانی کی راہ نکل سکتی ہے۔ الیکشن کے وقت صوبائی یا قومی اسمبلی کی نائیدگی کے امیدوار کے لیے جو شرائط پوری کرنا ضروری ہیں، ان کی زد کسی طرح بھی ان حضرات پر نہیں پڑتی جو انتخاب کے وقت تو امیدوار

کھڑے نہیں ہوتے اور انتخاب کے بعد مجلس قانون ساز کو تنفیذ کا نشانہ بناتے ہیں، بلکہ بلا امتیاز ملک کے ہر شہری کو ہوتا ہے۔ کہ وہ ایک ہی کامبرینے کا امیدوار ہو سکتا ہے۔ اور جو لوگ اپنے آپ کو دوسروں کی نسبت نہ صرف امیدواری بلکہ نمبر کی کاسب سے زیادہ اہل سمجھتے ہیں، بدرجہ اولیٰ حق رکھتے ہیں کہ وہ امیدوار کھڑے ہوں، اور اگر امیدواری اور انتخاب میں اتنی آزادی کے باوجود کوئی ضرور اپنے آپ کو امیدوار نہیں بناتا اور عوام کو موقع نہیں دیتا کہ وہ اسے منتخب کر کے اس کی اہلیت سے فائدہ اٹھا لیں، تو ایسی صورت میں عوام کو بھی ایسے افراد کیساتھ وفاداری کے بارے میں نظر ثانی ہوگی، اس بات پر غور کرنا ہوگا کہ انتخاب میں مواتع کی فراوانی اور آسانی کے باوجود ملک کے وہ افراد جو اپنی اہلیت کا دوسروں کی نسبت زیادہ اعلان کرتے ہیں، وقت پر کیوں آگے نہیں آتے، اور انہیں کیوں موقع نہیں دیتے کہ وہ اپنی وفاداری کا ثبوت عملاً ان کو منتخب کر کے پیش کریں۔ اگر مواتع پاکستان سے اب تک کی تاریخ پر غور کریں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ جو حضرات اپنی اہلیت کا زیادہ اعلان کرتے ہیں، موقع آتے پر انہوں نے انتخاب میں امیدوار ہونے کی "نا اہلیت" کا دوسروں کی نسبت سب سے زیادہ ثبوت دیا، اور جن حضرات نے کوشش کی مری طرح ناکام ہوئے۔ انتخاب میں حصہ نہ لینے والے حضرات درحقیقت اپنے آپ کو اس کا اہل نہیں سمجھتے ورنہ اتنے دافر مواتع کے موجودگی میں کوئی وجہ نہیں کہ وہ اپنے آپ کو نمبر کی لیے امیدوار کھڑا نہ کریں، اسی صورت حال سے کم از کم عوام پر یہ بات واضح ہو جانی چاہیے، کہ اہلیت کا کیا معیار ہے۔ وقت سے پہلے اس کا وضد وراپٹنا یا وقت آنے پر اس کا ثبوت دینا؟

اپنی تاریخ کے اس پس منظر میں نمائندگان مجلس قانون کے مخالفین اور عوام کو سنجیدگی سے غور کرنا چاہیے کہ سز کام کے انجام دینے کے کچھ نہ کچھ قواعد ہوتے ہیں کچھ تقاضے ہوتے ہیں، اور جب تک وہ پورے نہ ہوں اہلیت کا دعویٰ پورا نہیں ہوتا کسی فن سے مجرود واقفیت ہی اس بات کی دلیل نہیں ہوتی کہ فن سے واقفیت رکھنے والا اس عملی طور پر انجام دینے کا بھی اہل ہے۔ پریکٹس اور محضوری میں بہر حال فرق ہے، واقفیت اور واقفیت کو عملی جامہ پہنانے کی اہلیت دو مختلف چیزیں ہیں، ہمارے خیال میں عوام اس بنیادی نقطے سے واقف ہیں، اس لیے باوجودیکہ وہ ایسے حضرات کا احترام کرتے ہیں ان کے ساتھ وفاداری کا اظہار بھی کرتے ہیں، لیکن انہیں عملی طور پر نمبر کی لیے انتخاب کے میدان میں آنے کا مشورہ نہیں دیتے، اس لیے کہ وہ جانتے ہیں کہ انہیں ان قواعد و ضوابط اور ان علوم سے استفادہ کرنے کا موقع نہیں ملا جو واقفیت کو عملی طور پر انجام دینے کی اہلیت میں بدل سکتے ہیں۔

آخر میں ہم صرف یہ کہنا چاہتے ہیں کہ موجودہ کشمکش اور ذہنی انتشار کا حل صرف اس میں ہے کہ متغذہ کو پھر سے خلافتِ راشدہ کی طرح حکومت کا باقاعدہ ذمیفہ قرار دیا جائے۔ موجودہ متغذہ بہر حال انتظامیہ اور عدلیہ سے

الگ ہوگی جیسی کہ یہ ہے۔ اور اس کے خلاف ہر وہ ادارہ و نظام یا افراد جو اس کے متوازی "مقتضیٰ" کی حیثیت اختیار کیے ہوئے ہوں، انہیں غیر سرسختی قرار دے کر عوام کو "دوسری دغا داری" کے بارگراں سے نجات دلائی جائے۔ ملک کے بعض افراد جو اپنے آپ کو مقتضیٰ کے لیے سب سے زیادہ اہل سمجھتے ہوں، عوام کے سامنے انتخاب کے لیے اپنے آپ کو امیدوار پیش کر کے اور منتخب ہو کر عوام کی طاقت اور اپنی اہمیت کی دوسری قوت سے قانون سازی کا کام انجام دیں۔ اور ناکامی کی صورت میں دیانتداری کا تقاضا یہ ہے کہ اپنی کوتاہیوں کا جائزہ لیں۔ اور حقیقت کو سمجھیں کہ قیادت کے انداز ہر زمانے میں مختلف ہوتے ہیں اور خصوصاً دور جدید میں قانون سازی کے کچھ ضابطے ہیں جنہیں پورا کیے بغیر نہ تو قانون سازی جیسے اہم فریضے سے عہدہ برآ ہوا جا سکتا ہے اور نہ عوام اس کے بغیر کوئی قیادت تسلیم کرتے ہیں،

حوالہ جات و حواشی

۸۹۔ یہاں "درس" سے مراد حکومت کے وظائف ثلاثہ (مقتضیٰ، انتظامیہ اعلیٰ) کے باہر غیر سرسختی طور پر حکومت کو تختہ مشق بنانے کے لیے درس و تدریس کا سلسلہ ہے۔

۹۰۔ ابن المقفع، الاسرار فی الصحابة، محمد کو علی، رسائل البلاء، القاهرة ۱۳۵۲ھ ص ۱۲۶

۹۱۔ تاریخ میں یہ سب متنازع فیہ ہے کہ خلفائے بنی عباس میں سے کس نے امام مالک بن انس کو ٹھکانا یا کرنے کی درخواست کی تھی الزرقانی نے مقدمہ شرح الموطا ص ۱ تا ۳ پر مختلف روایات درج کی ہیں، جن سے پتہ چلتا ہے کہ وہ خلفہ جس نے یہ درخواست کی تھی، ابو جعفر المنصور تھا حاجی خلیفہ، کشف الظنون عن اسامی المکتب والفقہون ۱۹۴۳ھ، استنبول ص ۱۹۰۸ پر طبقات ابن سعد کے حوالے سے زرقانی کے خیال کی تائید کرتا ہے۔ اس سلسلے میں ابو محمد عبداللہ بن مسلم نقیبہ الدینوری نے اپنی کتاب الامامة والیسارہ ۱۳۱۶ھ ص ۱۵۵ پر مفصل بحث کی ہے، اور اس روایت کو ابو جعفر المنصور کی طرف ہی منسوب کیا ہے۔

۹۲۔ الزرقانی، مقدمہ شرح الموطا ص ۱۔ فی روایت ان المنصور قال منع هذا العلم وروایان کتابا و جب شدائد ابن عمر و رضی ابن عباس و شرف ابن مسعود و اقصدا وسط الامور و ما جمع علیها الصحابة والائمة

۹۳۔ ابن سعد، طبقات، حاجی خلیفہ، کشف الظنون عن اسامی المکتب والفقہون ۱۹۴۳ھ، استنبول ص ۱۹۰۸

فعلت یا امیر المؤمنین لا تغفل هذا فان الناس قد سبقت لهم اتاویل و سوا احادیث و روایات و اخذ کل قوم بما بقی لهم و دونوا برذع الناس و ما اختار اصل کل بلد منهم لا ففسم کذا فی عقود الجمان۔